

رسائل و مسائل

طریق انتخاب کے مسئلے میں ریفرنڈم کی تجویز پر اعتراضات

سوال - طریق انتخاب کے مسئلے میں جماعت اسلامی نے ریفرنڈم کرنے کا جو مطالبہ کیا تھا اس پر مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف اعتراضات کیے گئے ہیں۔ میں ان کا خلاصہ پیش کر کے آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس ان اعتراضات کا کیا جواب ہے۔

۱) جداگانہ انتخاب اگر دین اور شریعت کے اصول و احکام کا لازمی تقاضا ہے تو اس پر عوام سے استصواب کیے کیا معنی؟ کیا اسی طرح کل نماز اور روزے پر بھی استصواب کر دیا جائے گا؟ کیا آپ یہ اصول فہم کرنا چاہتے ہیں کہ عوام کی اکثریت جس چیز کو حق کہے وہ حق اور جس چیز کو باطل کہے وہ باطل؟ فرض کیجیے کہ ریفرنڈم میں اکثریت کا فیصلہ مخلوط انتخاب کے حق میں نکلے تو کیا آپ اس کو حق مان لیں گے اور بھڑکنا انتخاب اسلامی اصولی و احکام کا تقاضا نہ رہے گا؟

۲) جداگانہ اور مخلوط دونوں ہی طریقے غیر اسلامی ہیں، کیونکہ اسلام کی رُو سے تو مجلس شوریٰ میں غیر مسلم کی نمائندگی ہی اصولاً غلط ہے۔ آپ جب جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کرتے ہیں تو کیا اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ نے اسلامی ریاست کی مجلس شوریٰ میں غیر مسلم کی شرکت کا اصول مان لیا؟

۳) استصواب رائے کی تجویز لا کر اپنے طریق انتخاب کے مسئلے کو اس خطرے میں ڈال دیا ہے کہ شاید اس کا فیصلہ مخلوط انتخاب کے حق میں ہو۔ آخر آپ کے پاس اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ اس کا نتیجہ لازماً جداگانہ طریق انتخاب ہی کے حق میں ہوگا؟

۴) یہ عجیب بات ہے کہ آپ مخلوط انتخاب کے مخالف ہیں مگر طریق انتخاب کا فیصلہ مخلوط رائے شماری سے کرانے کے لیے تیار ہیں۔ آخر ریفرنڈم بھی تو مخلوط ہی ہوگا۔

۵) آپ طریق انتخاب کے مسئلے پر ریفرنڈم کرنے کے بجائے یہ کیوں نہیں دیتے کہ آپ کے اندر

انتخابات عام میں اس مسئلے پر الیکشن ٹریس؛ اگر عوام انسان جہاد گانہ انتخاب کے حامی ہیں تو وہ انہی لوگوں کو ووٹ دینگے جو اس طریق انتخاب کے حامی ہونگے۔ اس طرح اس مسئلے کا تصفیہ ہو جائیگا۔

(۶) ریفرنڈم کے لیے ملک کے موجودہ دستور میں کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لیے ناگزیر ہو گا کہ پہلے قومی اسمبلی اس مقصد کے لیے دستور میں ترمیم کرے۔ اور ترمیم کے لیے لامحالہ ۲/۳ اکثریت درکار ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ جب مخلوط انتخاب کے قانون کو بدلنے کے لیے مجرّد اکثریت بہم نہیں پہنچ رہی ہے تو ریفرنڈم کے لیے ۲/۳ اکثریت کہاں سے بہم پہنچے گی؟

(۷) جمہوری ممالک میں بالعموم ریفرنڈم کے ذریعہ سے ملکی مسائل کا فیصلہ کرنے کے بجائے پارلیمنٹ یا ایوان نمائندگان ہی کو آخری فیصلے کے اختیارات دیئے گئے ہیں۔ براہ راست عوام سے مسائل کا تصفیہ کرانے میں بہت سی قیاحیں ہیں جن کی وجہ سے یہ طریقہ جمہوری ملکوں میں مقبول نہیں ہوا ہے۔

یہ ہیں وہ بڑے بڑے اعتراضات جو ریفرنڈم کی تجویز پر میں نے سنے یا پڑھے ہیں۔ ان سے کم از کم شک یا تذبذب کی کیفیت کو ذہنوں میں پیدا ہو رہی جاتی ہے، اس لیے مناسب ہو گا کہ آپ ان سب کو صاف کر کے عوام کو اس مسئلے میں پوری طرح مطمئن کر دیں۔

جواب۔ ان اعتراضات سے مجھ کو اپنے دوروں کے سلسلے میں متعدد مواقع پر سابقہ پیش آیا ہے اور میں نے اپنی تقریروں میں ان کے جوابات بھی دیئے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلسل سفر کی وجہ سے تحریری صورت میں ان پر بحث کی نوبت نہ آ سکی۔ اس تفصیلی سوالنامے کا جواب بھی بڑی تاخیر سے دیا جا رہا ہے

(۱) پہلا اعتراض جن اصحاب نے پیش فرمایا ہے ان کو شاید معلوم نہیں ہے کہ پاکستان کا نظام حکومت ابھی تک دین اور شریعت کے اصول و احکام پر قائم نہیں ہوا ہے، بلکہ اس جمہوری دستور پر قائم ہے جو اکثریت کو فیصلہ کن اختیار دیتا ہے۔ اگر کہیں یہ بات یہاں طے ہو چکی ہو تو کہ جو کچھ دین اور شریعت کی رو سے ثابت ہو وہی ملک کا قانون ہو گا تو پھر معنا ہی کس بات کا تھا۔ یہی ایک مسئلہ کیا معنی کسی مسئلے کو بھی دین کے منشا کے مطابق حل کرنے میں کوئی زحمت پیش نہ آتی جس مسئلے میں بھی دلائل شرعیہ سے ایک حکم ثابت کر دیا جاتا وہ خود بخود قانون بن جاتا اور اس کے خلاف جو قانون بھی ہوتا وہ آپسے آپ منسوخ ہو جاتا۔ لیکن آخر یہ بات کس سے

چھی ہوئی ہے کہ یہاں عملاً یہ صورت حال موجود نہیں ہے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے نیشنل اسمبلی کی اکثریت نے مغلوط انتخاب کا قانون پاس کیا اور وہ ملک کا قانون بن گیا۔ اب اس قانون کو اگر بدلا جاسکتا ہے تو اکثریت ہی کے فیصلے سے بدلا جاسکتا ہے۔ ورنہ تمام علماء و اہل کربھی اگر متفقہ فتویٰ دے دیں کہ مغلوط انتخاب اسلام کے خلاف ہے تب بھی قانون اپنی جگہ جو قانون قائم رہیگا۔ ایسی حالت میں خواہ مخواہ خیالی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟ آپ طریق انتخاب کے اس مغلوط قانون کو واقعی بدلوانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے وہ طریقہ اختیار کیجیے جو موجودہ جمہوری نظام میں ممکن العمل اور مؤثر ہو سکتا ہے۔ ایسا نہ کریں گے تو حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ آپ لائل و براہین کے انبار لگاتے رہیں گے اور انتخابات مغلوط بنیاد پر ہوتے رہیں گے۔

یہ کہنا کہ کیا کل نماز اور روزے پر بھی ریفرنڈم کرایا جائیگا، ایک اور بے خبری کی دلیل ہے۔ ان حضرات کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہاں آج نماز اور روزے کی جو آزادی حاصل ہے وہ بھی اس بنا پر نہیں ہے کہ شریعت سے یہ احکام ثابت ہیں، بلکہ صرف اس بنا پر ہے کہ دستور نے بنیادی حقوق کے سلسلے میں باشندوں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کا حق دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ملک کی مجالس قانون ساز اکثریت کے ووٹ سے نماز اور روزے کے احکام میں بھی رد و بدل کر سکتی تھیں، اور اس کے ایسے قوانین سے نجات پانے کی کوئی سبیل اس کے سوا نہ ہو سکتی تھی کہ یا تو بغاوت کیجیے، ورنہ جمہوری طریقے سے فیصلہ کرانے کے لیے ریفرنڈم کا مطالبہ کیجیے۔

مجلس قانون ساز کے فیصلے اور ریفرنڈم کے فیصلے میں درحقیقت اصولی حیثیت سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں جگہ اکثریت ہی کا فیصلہ مؤثر ہوتا ہے۔ فرق صرف عملی صورت کا ہے۔ ایک جگہ مجلس قانون ساز کے ارکان کی اکثریت فیصلہ کرتی ہے اور دوسری جگہ ملک کے عام باشندوں کی اکثریت۔ اب یہی عجیب بات ہے کہ جو لوگ مجلس قانون ساز کے معاملے میں اکثریت کے اختیار است قانون سازی کو مانے بیٹھے ہیں وہ عوام کی اکثریت کے اختیار کا نام سن کر شور مچانے لگتے ہیں۔

ریفرنڈم کے متعلق یہ بات بھی ان حضرات کو معلوم نہیں ہے کہ وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ ملک کا قانون کیا ہوا اور کیا نہ ہو۔ جس چیز کو ہم باطل سمجھتے

ہیں اگر ریفرنڈم میں اکثریت کا فیصلہ اس کی تائید میں ہو جائے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اسے حق مان لیں گے، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ملک کا قانون وہ چیز قرار پائے گی جس کی تائید میں اکثریت نے فیصلہ دیا ہے۔ ہمیں اس کے بعد بھی یہ حق حاصل ہے کہ اسے باطل کہیں، اس کے بطلان پر دلائل لائیں اور عوام کی رائے کو اس کے خلاف تیار کرتے رہیں، یہاں تک کہ عوام ہی کی اکثریت کو فیصلہ بدلنے پر راضی کر لیں۔ آخر اس جو اکثریت کے فیصلے سے ملک کی اسمبلیوں میں قوانین بنتے ہیں ان میں سے کس قانون کا بن جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اقلیت نے اس کو حق مان لیا اور اس کے خلاف اپنی رائے کو باطل تسلیم کر لیا؟

(۲) دوسرا اعتراض جن لوگوں نے پیش کیا ہے ان کی پوزیشن بھی عجیب ہے۔ جب دستور میں غیر مسلموں کو نمائندگی کا حق دیا گیا اس وقت وہ خاموش ہے۔ جب مخلوط انتخاب کا قانون پاس ہوا اس وقت بھی وہ مہم میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہے۔ آج بھی غیر مسلموں کے حق نمائندگی کو دستور سے منسوخ کرانے کے لیے وہ کوئی ایجنڈیشن نہیں فرما رہے ہیں۔ یہ نکتہ ان کو صرف اس وقت سوچنا ہے جب جباً کا نہ انتخاب کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ دراصل یہ اپنے مخصوص پیشواؤں کی پیروی میں مسلم و غیر مسلم کی متحدہ قومیت کے قائل ہیں اور ان کے پیش نظر صرف یہ ہے کہ کسی طرح مخلوط انتخاب یہاں رائج ہو جائے۔ غیر مسلم کے حق نمائندگی کا انکار عرف ایک بہانہ ہے جو اپنی اغراض کے لیے انہوں نے استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ ورنہ یہ بتائیں کہ اپنے ان پیشواؤں کے متعلق ان کی کیا رائے ہے جنہوں نے ہندوستان میں اپنی سیاست کے قیام کی حمایت فرمائی تھی رہا ان کا اصل اعتراض، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے مخلوط اور جباً کا نہ انتخاب کی حیثیت ہرگز یکساں نہیں ہے۔ مخلوط انتخاب کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ایک ملک کے رہنے والے تمام باشندے، خواہ وہ مسلم ہوں یا ہندو یا عیسائی یا پارسی، سب ایک قوم ہیں، ملک کی حکومت اس واحد قومیت کی مشترک حکومت ہے، اور اسے چلانے کا کام ان لوگوں کے سپرد ہونا چاہیے جو بلا امتیاز دین و مذہب اس قوم کے تمام افراد کے مشترک نمائندے ہوں۔ یہ نظریہ سرے سے اسلامی ریاست ہی کے تصور کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اس پر جو نظام حکومت قائم ہو گا وہ لازمًا صرف لادینی ہو گا۔ اس میں اسلام اور دوسرے مذاہب ایک سطح پر آجائیں گے اور ان میں سے کسی کو بھی ملک کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہ ہو گا۔ اس کی اسمبلیوں میں منتخب

ہو کر آئیوں گے نمائندے اپنی شخصی حیثیت میں خواہ مسلم یا ہندو یا عیسائی ہوں، مگر نمائندہ ہونے کی حیثیت سے وہ صرف پاکستان قوم کے نمائندے ہونگے اور ان کو کسی مذہب یا مذہبی گروہ کی طرف سے بولنے کا حق نہ ہوگا۔ اس کے بعد یہاں موجود دستور کی ان دفعات کے بھی باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے جنہیں ہم اسلامی دفعات کہتے ہیں، کیجا کہ یہاں کبھی کبھار معنوں میں اسلامی حکومت قائم ہونے کی امید کی جاسکے۔ اب کون صاحب عقل آدمی کہہ سکتا ہے کہ یہ نظریہ اور جدگانہ انتخاب کا نظریہ دونوں اسلامی نقطہ نظر سے برابر کی حیثیت رکھتے ہیں؟ جدگانہ انتخاب قومیت کی بنیاد پر چلتا ہے اور اس سے مسلمانوں کی مستقل قومیت برقرار رہتی ہے۔ اس کے ذریعے سے مسلمان نمائندے صرف مسلمانوں کی رائے سے منتخب ہونگے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بولنے کے مجاز ہونگے۔ ان نمائندوں کی اکثریت اگر اسلامی ذہنیت رکھنے والی ہو تو وہ موجودہ دستور کی وی ہوئی گنجائشوں سے فائدہ اٹھا کر نظام حکومت کو اسلام کی راہ پر چلا سکیں گی اور اس صورت میں ہر وقت یہ ممکن ہوگا کہ دستور کو بھی بدل کر پورا پورا اسلامی بنادیا جائے اس نظام میں زیادہ سے زیادہ اگر کوئی قباحت ہے تو صرف یہ کہ اس کے اندر غیر مسلم نمائندے بھی قانون سازی اور حکومت کی رہنمائی میں حصہ دار ہونگے۔ اس چیز کی اصلاح اس صورت میں تو کسی نہ کسی وقت ہو سکے گی جبکہ نظام حکومت کی بنیاد اسلامی ہے لیکن مخلوط وطنی قومیت کا نظریہ قائم ہو جانے کے بعد دوسرے سے یہ بنیاد ہی باقی نہ رہیگی۔

(۳) تیسرا اعتراض صرف ایک واہمہ ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر پورے ملک میں طرقی انتخاب کے مسئلے پر استصواب برائے ہو تو مخلوط انتخاب کے حق میں فیصلہ ہونے کا ایک فی صد بھی امکان نہیں ہے جہاں تک مغربی پاکستان کا تعلق ہے، یہاں ہر شخص جانتا ہے کہ عوام اور خاص کی بڑی عظیم اکثریت اس طرقی انتخاب کی سخت مخالف ہے حتیٰ کہ ان لوگوں کے خلاف یہاں شدید نفرت پائی جاتی ہے جو اس لعنت کو پاکستان میں لانے کے موجب ہوئے ہیں۔ رہا مشرقی پاکستان، تو اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ وہاں مسلمانوں کی رائے کم از کم ۹۰ فی صدی جدگانہ انتخاب کے حق میں ہے، اور اب تو وہاں کے عوام ہی نہیں تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت بھی مخلوط انتخاب کی مخالف ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود غرض سیاسی لیڈر جو محض اپنے اقتدار کے لیے سووے بازی کر کے اس ملعون طرقی انتخاب کو رائج کرنے کے ذمہ دار ہیں، ریفرنڈم کا نام سنتے ہی کانپ اٹھتے ہیں، کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ مد نہ اگر ریفرنڈم میں ان کے جیتنے کا کچھ بھی امکان ہو تا تو وہ اس چیلنج کا سامنا کرنے سے یوں نہ گھبرائے۔

(۴) چوتھے اعتراض کو پیش کرنے والے حضرات شاید غلط فہمی میں ہیں کہ یہاں غیر مسلموں کو ووٹ دینے کا حق

حاصل نہ تھا اور اب یہ بات ہم نے بطور خود تجویز کر دی ہے کہ ریفرنڈم میں ان کی رائے بھی لی جائے۔ حالانکہ ملک کا دستور پہلے ہی یہ حق ان کو دے چکا ہے اور اس دستور کے تحت جو رائے شہری بھی کسی ملکی مسئلے پر ہوگی اس ان کو الگ نہ کیا جاسکے گا۔

(۵) انتخابات عام سے پہلے جس بنا پر ہم طرزی انتخاب کے مسئلے کا فیصلہ ریفرنڈم کے ذریعے سے کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو لامحالہ ملک کے پہلے انتخابات مخلوط بنیاد ہی پر ہونگے، اور اس طرزی انتخاب کی تبدیلی صرف انتخابات کے بعد ہی ہوسکے گی جس کا کوئی فائدہ دوسرے انتخابات کی نوبت آنے تک مترتب ہوسکے گا۔ اب یہ بات ہم مشرقی پاکستان کے حلقہ ہائے انتخاب کا پورا تجزیہ کر کے ناقابل تردید اعداد و شمار سے ثابت کر چکے ہیں کہ پہلا ہی انتخاب جو مخلوط بنیاد پر ہوگا اس کی بدولت وہاں ایسے لوگ بڑی تعداد میں منتخب ہو کر آجائیں جو ہنگامی قوم پرستی کے نشے میں سرشار ہیں اور ان ہی متحدہ ہنگامی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ لوگ اگر وہاں طاقت پکڑ گئے تو دوسرے انتخابات کی نوبت آنے سے پہلے ہی چند سال کے اندر وہ پاکستان کی وحدت و سالمیت پر ایک کاری ضرب لگا چکے ہونگے۔ اس خطرے کو جو لوگ برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں انہیں اختیار ہے کہ ریفرنڈم کی مخالفت کر کے مخلوط بنیاد پر انتخابات عام منعقد کرانے کی راہ ہموار کرتے رہیں۔ لیکن جو لوگ اس کے خطرناک نتائج کا کوئی احساس رکھتے ہیں ان کی پوزیشن سمجھنے سے ہم بالکل قاصر ہیں۔

(۶) چھٹا اعتراض چارے نزدیک دستور کی پوزیشن سے سراسر ناقصیت کا نتیجہ ہے۔ طرزی انتخاب پر ریفرنڈم کرانے کے لیے دستور میں کسی ترمیم کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، کیونکہ دستور کی کوئی دفعہ اس خاص مسئلے پر یا کسی ملکی مسئلے پر بھی ریفرنڈم کرانے میں مانع نہیں ہے جسے بدلے بغیر یہ کام نہ کیا جاسکتا ہو۔ دستور نے طرزی انتخاب کا فیصلہ کرنے کے لیے نیشنل اسمبلی کو صرف ایک دفعہ دونوں صوبائی اسمبلیوں کے رائے لینے کا پابند کیا تھا سو شرط پوری کی جا چکی ہے۔ اس پابندی کا تقاضا پورا ہو جانے کے بعد اب اس اسمبلی پر کوئی پابندی نہیں ہے جسے منع کرنے کے لیے کسی دستوری ترمیم کی حاجت ہو۔ اور اس پابندی کو کسی ہیر پھیر سے بھی یہ معنی نہیں پہنچا۔ نہ جاسکتے کہ نیشنل اسمبلی دونوں صوبائی اسمبلیوں کے رائے لینے کے علاوہ اگر کسی اور ذریعے سے بھی رائے عام معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کرے تو دستور ایسا کرنے میں مانع ہے۔ اس لیے یہ اسمبلی جب چاہے ریفرنڈم کرنے سے بھر داکثریت سے ایک قانون پاس کر سکتی ہے۔

(۷) ساتویں اقراض میں اول تو یہی بات غلط کہی گئی ہے کہ جمہوری ممالک میں بالعموم ریفرنڈم کا طریقہ رائج نہیں ہے۔ یہ بات صرف ان ممالک کے حق میں صحیح ہے جو برطانوی جمہوریت کے نقال یا فرانسیسی طرز جمہوریت کے مقلد ہیں باقی سب دوسرے جمہوری ممالک تو ان میں یہ طریقہ بالعموم رائج ہے۔ سوئٹزرلینڈ تو اس معاملہ میں مشہور ہی ہے اس کے علاوہ آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ اور آئرلینڈ فری اسٹیٹ کے دستور میں بھی اس کے متعلق واضح دفعات موجود ہیں آسٹریلیا میں سالہ ۱۹۲۵ء تک ۱۲ مرتبہ اور نیوزی لینڈ میں سالہ ۱۹۱۱ء سے سالہ ۱۹۲۸ء تک ۶ مرتبہ ریفرنڈم ہو چکا ہے کینیڈا میں بھی کئی مرتبہ دستوری مسائل پر ریفرنڈم ہوا ہے اور لوکل گورنمنٹ کے مسائل کا فیصلہ کرنے کے لیے تو وہاں کثرت سے طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یورپ میں آسٹریا، جرمنی، ایٹلی، یوگوسلاویا، لٹویا اور چیکو سلوواکیا کے جمہوری دستور ریفرنڈم کے متعلق اہم دفعات پر مشتمل ہیں امریکہ کی دو ریاستوں کے سوا باقی تمام ریاستوں میں دستوری مسائل پر ریفرنڈم کرنے کا طریقہ رائج ہے، اور قانونی امور پر بھی ۳۴ ریاستوں میں ریفرنڈم کرایا جاسکتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ جمہوری ممالک میں بالعموم پارلیمنٹ یا ایوانِ نمائندگان ہی کو فیصلے کے آخری اور قطعی اختیارات دیدیئے گئے ہیں اور عوام کو قوانین بنانے یا بدلنے کے ہر اختیار سے محروم کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

یہی بات کہ عوام سے مسائل کا تصفیہ کرنے میں کچھ قباحتیں ہیں جن کی وجہ سے طریقہ جمہوری ملکوں میں مقبول نہیں ہوا ہے تو حقیقت یہ بھی ایک دعویٰ ہے جو ماورائے حقیقت کی وجہ سے کر دیا گیا ہے، ورنہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایوانِ نمائندگان کو آخری اور قطعی اختیارات دے دینے میں کچھ ایسی قباحتیں ہیں جن کا تجربہ کرنے کے بعد جمہوری ممالک میں ریفرنڈم کے طریقے کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ امریکہ میں اس طریقے کا رواج بیسویں صدی کے آغاز سے ہوا ہے اور اس کی ایک بڑی دستور یا یہ بیان کرتا ہے: "ممالک متحدہ امریکہ میں عوام کی طرف سے براہِ راست قانون سازی کا طریقہ رائج ہونے کی وجہ سے ہے کہ لوگ اپنی ریاستوں کے ارکان مجاس قانون سازی کی کارگزاری سے غیر مطمئن ہو گئے ہیں۔ قابلِ اعتماد قیادت کا فقدان، مخصوص مفادات رکھنے والوں کا ارکانِ مجاس سے مل کر ان کی رائے پر اثر انداز ہونا، اور بعض بڑے بڑے سیاسی اجارہ داروں کا وقتاً فوقتاً قانون ساز مجاس پر حاوی ہو جانا، یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں دیکھ دیکھ کر بیسویں صدی کے آخری دو دہائیوں کے لوگ اپنے قانون سازوں سے غیر مطمئن ہوتے چلے گئے۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ اگر ہم براہِ راست کام کریں تو اس سے بدتر کارگزاری تو نہ دکھائیں گے، بلکہ شاید اس سے بہتر ہی کر دکھائیں۔ اس بنا پر انھوں نے قوانین بنانے اور اور مجاس قانون ساز کے بجائے نئے قوانین کو رد کرنے کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لیے،